# حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۳

# تارے کی تولید

آپ نے علم نجوم کی کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ فضائے آسمانی میں تارے کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ سائنس یہ بتاتی ہے کہ ابتدائے آفرینش میں فضا مادی ذرات سے بھری ہوئی تھی، اور ہر ذرّے کی باطنی طاقت اس کو پھیلاؤ کی طرف آمادہ کرتی تھی۔ یہ طاقت اس میں گرمی اور روشنی کی شکل میں موجود تھی۔ اور دوسری طاقت جو ذرّوں کی باہمی کشش سے ان کو آپس میں سیکٹر کریک جا کرنے اور ٹھوس بنانے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے موجود تھی۔

طاقتوں کا یہ تضاد مادہ کی ازلی صفت اور کروڑوں سال میں ایسا ہوتا ہے کہ جب کہیں کائنات میں ان دونوں طاقتوں کا توازن میزان میں صحیح اترتا ہے تو یک لخت یہ فضائی گرد انتہائی تیزی کے ساتھ یکجا ہو کر ستارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ تار اپنی گرمی کے سبب آگ بن جاتا ہے اور اس تیزی کے ساتھ چلتا ہے کہ اس کا درجہ حرارت دنیا کی ہر آگ سے دس ہزار گنا تیز تر ہوتا ہے۔ سورج بھی دوسرے تاروں کی طرح ایک تاری ہے مگر چونکہ اور تارے سورج سے نسبتاً بہت فاصلہ پر ہیں اس لئے ان کی روشنی اور گرمی ہم تک بہت ہی قلیل مقدار میں پہنچتی ہے کُل فضا میں گرد ہی گرد ہے۔ نہ وقت کا تعین نہ وجود کا تعین۔ اس ماحول میں جب ایک تارا نمودار پاتا ہے تو اس تارے سے مکان کا تعین، زمان کا تعین اور رُخ کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ یہ فضائی گرد باطنی اور ظاہری طاقتوں کا تصادم ہے اور قرنوں سے ہوتا چلا آیا ہے کہ وقت کی شہادت ایک تارے کی انفرادی وجود کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یہ تارا خود بھی جلتا ہے اوروں کو بھی جلاتا ہے۔ خود وجود پا کر عالم کو وجود میں لاتا ہے۔ خود زندہ بن کر زندگی بخشتا ہے اور اپنی انفرادیت کو فنا کرنے کے بعد فطرت میں موت کی شکل میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ قوموں نے اگر ہم سے پہلے تلاشِ حق میں سورج کو معبودِ حقیقی مانا تھا تو ان کے شعور کے لحاظ سے بے جا نہ تھا۔ مادی وجود کا برہما وشنو اور شیو یہی ہے۔

اسی طرح مادی طاقتوں کے علاوہ زندگی اور حیات کی بھی بہت سی طاقتیں موجود ہیں۔ ایک تارے کی تخلیق کے لئے جس طرح کئی طاقتیں آپس میں متحد ہوتی ہیں، اسی طرح زمان و مکان کی کئی طاقتیں قبلہ نما کی طرح چکر کاٹ کاٹ کر جب مرکز پر آجاتی ہیں تو ایک ایسا انسان پیدا ہوتا ہے جو لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا مصداق ہوتا ہے۔ صدہا سال کے صحیح خاندانی روابط اور پھر بدلتے رہنے والے ماحول سے ہم آہنگی کرنے والی انفرادیت کے سبب ایک ایسی صورتِ حال وجود میں آتی ہے جس میں وہ انسان خود بخود پیدا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صانعِ قدرت نے بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اسے اپنے ہاتھوں سے سنوارا اور ڈھالا

ہے۔ گو یہ واقعات ارتقائے حیات کے لازم و ملزوم جز ہیں۔ مگر ایسے شخص کی پیدائش تاریخِ انسان میں ایک سنگ میل ہوتی ہے اور اس کا وجود ایک بہت بلند منزل اور مینارِ نور ہوتا ہے۔ جس کو صدیوں تک انسان پیش نظر رکھ کر بڑھتا چلا جاتا ہے اس واقعہ یا سانحہ حیات کے ساتھ اور عجیب و غریب باتیں بھی نمودار ہوں تو تعجب کی کون سی بات ہے۔ جب قسمت اور فطرت دونوں اس وجود کے ہمراز و ہم ساز ہوں تو کائنات وجود میں اور دوسرے رنگوں میں بھی اس کا اثر کیوں نہ ہو۔

سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط کی عبرت انگیز داستان سے کون واقف نہیں اور کون نہیں جانتا کہ سلطنت کا وقار اور جلال کس طرح تہذیب و تمدن کی نفاستوں اور رنگینیوں میں کھو گیا۔ کسی طرح ایمان کی حرارت صرف اخلاقی مٹھاس بن کر رہ گئی۔ اور باطن کی عظمت صرف ظاہری وجاہت میں تبدیل ہو گئی۔ جب بھی کسی تہذیب یا تمدن نے اپنے عروج پر پہنچ کر موت کی آخری ہچکی لی ہے تو فطرت کی بھی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ دور مغلیہ کا فطرت شناس شاعر مرزا غالب فطرت کے اس غم کا ایک آنسو تھا۔

جس طرح ہر فرد کی ایک روح ہوتی ہے اور اس کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم و ملّت کی بھی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں نشو و نما پاتی ہے۔ اور جب اس ملّت کی موت کا وقت آجاتا ہے تو شمع کی آخری بھڑک کے ساتھ ایک بہت ہی نمایاں ہستی عالمِ وجود میں آتی ہے اور نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا نیا باب کھلتا ہے۔

شمالی ہند میں ظفر شاہ کی زندگی کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا دفتر بند ہو گیا۔ اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کی شہادت سے شیرازہ بندی ٹوٹ گی تو ایسی کیفیتیں موجود تھیں جو دلوں کو گرما رہی تھیں اور آنکھوں میں آنسوئوں کے ایسے قطرے مچل رہے تھے جو ڈھلکنے کی بے حجابی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ چند قلوب جو قدسی طاقتوں کے متحمل ہو سکتے تھے۔ فضائی کیفیت کے حامل بن گئے اور مقصدِ حیات کی تکمیل کرتے رہے۔

ترچناپلی کے نواب قادر خاں ایسے ہی بزرگوں میں تھے جنہیں ایک ڈوبتی ہوئی سلطنت اور ایک غرق ہونے والی کشتی کا آخری ملاح کہا جاسکتا ہے بظاہر ایک بادشاہ بباطن ایک فقیر جہاں موصوف کا شعور فروغِ اسلام اور اس کے جاہ و عظمت کی پامالی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہیں ان کے قلب میں ٹیپو سلطان کے ایمان کی تلواریں بھی چمکتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب برطانیہ کی طرف سے باز پُرس ہوئی تو نواب قادر خاں صاحبؒ کے دو صاحبزادے محمد علی خاں اور سردار خاں برما بھیج دیئے گئے۔

نواب محمد علی خاں نے اپنے لڑکے یعنی بابا قادر اولیا سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا تھا۔ تمہارا نام تمہارے دادا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ہمارا خاندان درویشوں کا خاندان ہے، تم فقیری کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ میرے نصیب میں تو نہ تھا مگر تم ناگپور ضرور جانا۔ ہمارے

خاندان میں بہت سے صاحبِ مرتبہ بزرگ گزرے ہیں۔ تمہارے تایا سردار خاں صاحب کا ویزاک (Vizaq) میں مزار ہے۔ ان کی کرامتوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ تمہاری دادی، بی اماں بڑی بزرگ تھیں۔ اکیسویں زچگی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بطن سے پندرہ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ مگر سوائے میرے اور تمہارے چچا یوسف خاں کے جن کا خاندان بڑھ گڑھ مالابار میں ہے سب کے سب لڑکے اکیس سال کی عمر ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ اور لڑکیاں سن بلوغ سے پہلے ہی فوت ہو گئیں۔ آخری لڑکی جس کی عمر تقریباً گیارہ سال کی تھی۔ اس نے کاجو کا پھل کھالیا جس کی وجہ سے سارا گلا پھول گیا اور سانس بند ہو گئی اور وہ تیسرے دن انتقال کر گئی۔ مجھے اور تمہارے چچا کو جب میری عمر پانچ سال کی تھی گورنمنٹ نے برما پرورش کے لئے بھیج دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک نیم پختہ انڈا اور دودھ پلایا جاتا تھا۔ اور کھانے کے لئے اُبلا ہوا گوشت، سیاہ مرچ اور نمک ڈال کر دیا جاتا تھا۔ جب میری عمر گیارہ سال کی اور تمہارے تایا سردار خاں کی پندرہ سال کی ہوئی تو والد صاحب کو دکھانے کی غرض سے ہم دونوں کو مالابار بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک دن ہم لوگ کاویری ندی پر نہانے گئے۔ میرے عزیزوں نے گورنمنٹ کو یہ جھوٹ موٹ رپورٹ دے دی کہ سردار خاں نہاتے وقت بہہ گیا اور بہت واویلا کیا۔ کچھ دنوں کے بعد تمہارے دادا نے گورنمنٹ کو یہ درخواست دی کہ میرا ایک ہی لڑکا رہ گیا ہے اس کو برمانہ بھیجا جائے۔ گورنمنٹ نے یہ درخواست منظور کر لی اور مجھ کو مع دو ملازموں کے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ ہم تینوں کے کھانے کے خرچ کے لئے اَسّی روپے ملتے تھے اور اسکول کی فیس تیرہ روپے۔ علی گڑھ میں علاوہ اور چیزوں کے عربی اور مذہبی علوم مجھے خاص طور سے سکھائے گئے۔ جب میں فارغ التحصیل ہوا تو فوج میں فرانٹیر کی آٹھویں رجمنٹ کا پیش امام بنا کر افغان وار میں بھیج دیا گیا۔ تمہارے دادا نے علاوہ بی اماں کے ایک ہندوستانی طوائف سے بھی شادی کی تھی۔ اس سے ایک لڑکی تھی جس نے ترچناپلی کے نواب کی کُل جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور میں نے قرآن شریف اُٹھا کر یہ قسم کھائی تھی کہ آبائی جائداد کا ایک حبّہ بھی نہیں لوں گا، محنت کروں گا، بھیک مانگوں گا اور زندہ رہوں گا۔ مگر یہ روپیہ میرے لئے حرام ہے۔ عرصہ کے بعد جب میں ریٹائر ہو کر دجیانگرم میں مقیم تھا تو گورنمنٹ کی طرف سے میرا حصہ پچاس ہزار روپے آیا۔ مگر میں نے اسے منظور نہ کیا اور گورنمنٹ نے اسے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۳۸ء میں بابا قادر اولیا کے سوتیلے خالو جو پولیس میں ملازم تھے اپنی کسی ڈیوٹی پر وجیانگرم تشریف لائے اور بابا صاحب کی موجودہ قیام گاہ پر آ کر جب بابا صاحب کو دیکھا تو ان کے جذبات میں اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ روتے روتے بیہوش ہو گئے پھر بابا صاحب کی والدہ محترمہ سے ملاقات کر کے روئے اور کہا کہ ہمارے خاندان کا ایک فرد ایسا بھی ہے جس نے فقیری کو نوابی سے بالاتر ثابت کر دکھایا۔

بابا صاحب کی پیدائش کا حال یوں ہے کہ آپ کے والد بزرگوار نواب محمد علی خاں فوج کے جس دستے کے ساتھ تھے۔ جب وہ دستہ منتشر کر دیا گیا اور آپ ریٹائر ہو گئے تو وجیانگرم میں قیام فرمالیا اور تاحیات مسجد کی پیش امامی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے وہاں ایک پرانے پٹھان خاندان میں شادی کر لی تھی اور بابا صاحب انہیں خاتون کے بطن سے ۳ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کو بروز جمعرات بعد نماز فجر پیدا ہوئے۔

وجیانگرم کا وہ محلہ جس میں بابا صاحب کی ولادت ہوئی۔ اپنی غریبی، شرافت اور اخلاص کی ایک تصویر ہے۔ مگر اہلِ محلہ کے دلوں کو دیکھئے تو ان میں مہمان نوازی، خلوص اور بے پناہ عقیدت موجود ہے۔ جو بڑی مہذب سوسائیٹیوں اور بڑے شہروں کے بڑے بڑے محلوں میں ناپید ہے۔ محلہ کے زیادہ تر مکان کچے ہیں۔ مگر جس مکان میں بابا صاحب پیدا ہوئے وہ چھوٹا سا پختہ مکان ہے جو اب بھی موجود ہے۔ بابا صاحب کے بعد پانچ لڑکیاں ہوئیں، جو شوہروں کے ساتھ وجیانگر میں مقیم ہیں۔ بابا صاحب کے والد صاحب قبلہؒ کی آخری اولاد سردار خاں تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی مگر اکیس سال کی عمر میں چیچک کے عارضے سے انتقال فرما گئے۔ ان کی اہلیہ بقیدِ حیات ہیں۔

وجیانگرم ایک عجیب شہر ہے۔ جو بہت سے قدیم رجواڑوں کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ایک طرف اگر ان راجاؤں کے محلات، قلعے اور شکار گاہیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں تو دوسری طرف عاشقانِ دین اور بڑی بڑی بزرگ ہستیوں کے مزارات بھی پائے جاتے ہیں۔ وجیانگرم کے زیادہ تر راجگان ان فقراء کے معتقد رہے ہیں اور مشکل وقتوں میں ان سے امداد طلب کی ہے۔

ان بزرگوں کے بہت سے واقعات اور کرامتیں وہاں کے عوام میں اب تک مشہور ہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد وجیانگرم کی راجدھانی بھی ختم ہو گئی اور تمام محلات میوزیم اور پستی کی کہانی کے ساتھ ساتھ پچھلی پانچ چھ صدیوں میں مست فقیروں اور کسی نہ کسی مردِ مومن کا وہاں آنا اور اس دنیاوی شان و شوکت اور نظم و ضبط کے ماحول میں مرکز حق بنا کر حق کا بول بالا کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔

جب قدیم شہروں میں مادی تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانی آبادی اُجڑ جاتی ہے تو دوسری مخلوق جیسے جنات اور ارواح خبیثہ وہاں اپنی سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جسے اللہ ہی جانتا ہے یا اس کے حبیب کو معلوم ہے۔ وجیانگرم میں بھی جنات اور ارواحِ خبیثہ کے ایسے واقعات گذرتے رہے جن کے آگے بڑے بڑے سائنسدانوں کے سر جُھک جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں بھی قائل ہو جاتی ہیں۔

فقراء کا کام بظاہر انسانیت کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر ان کا دائرہ عمل محدود نہیں ہے۔ جس محلہ میں بابا صاحب قبلہ کی ولادت ہوئی ہے، اس محلہ سے کچھ آگے ایک تالاب ہے جو کالے تالاب کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے کنارے ہندوئوں کے مردے جلائے جاتے ہیں۔ آج سے دس سال پہلے کی بات ہے کہ شیر کا سا دل رکھنے والے انسان بھی دن دھاڑے اگر اِدھر سے گذر جاتے تھے تو ان پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش آتا رہتا تھا۔ سارے شہر میں تاجروں کے علاوہ جتنے بھی مسلمان ہیں انتہائی غریب اور ناخواندہ ہیں۔ جب کسی سوسائٹی پر غربت چھا جاتی ہے تو بہت سی برائیاں بھی اس کے ساتھ ساتھ آجاتی ہیں۔ غربت خود سب سے بڑا گناہ ہے۔ مسلمان عوام کی حالت ہر جگہ اور ہر ملک میں اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ تقریباً ہر ملک میں فرد یا خاندان یا جماعت کے آگے نہ تو کوئی نصب العین ہے نہ کوئی ولولہ، نہ کوئی امید۔ پھر جوشِ عمل ہو تو کس بِرتے پر۔ اپنی غربت پر ہی راضی ہو کر مسلمان اپنا وقت یا تو ایک دوسرے کی برائی اور خانہ جنگیوں میں صرف کرتے ہیں یا کہیں کہیں۔ مذیب کا خول ڈال کر جنگیوں میں صرف کرتے ہیں یا کہیں کہیں مذہب کا خول ڈال کر ظاہر داری اور فرقہ بندی کی جنگ میں مبتلا رہتے ہیں۔

غرض ایسے ہی ماحول میں بابا صاحب کی پرورش ہوئی۔ آپ کا ظہور عین منشائے قدرت تھا اس لئے کہ روحِ انسانی کے ارد گرد جب تاریکی کا انتہائی غلبہ ہوتا ہے تو فطرت اسی تاریکی میں سے ایک چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ صدیوں کی تہذیب جب زیر زمین پہنچ کر کھاد بن جاتی ہے تو اس کھاد میں سے ایک گلاب پیدا ہوتا ہے۔ جس کی روح پرور خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے۔

بابا صاحب کے والد محترم ہر چند کہ مسجد میں پیش امام تھے۔ اور اکثر سجدے میں مگر دل ہی دل میں قوم کی بدحالی اور تباہی پر آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اور اکثر سجدے میں اپنے کریم سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ ”اے رب العزت مسلمانوں کے گناہوں کو بخش دے ان پر رحم کر اور ان میں ایک دفعہ پھر وہی زندگی اور ایمان کی تازگی پیدا کر جس کی روشنی نے ساری دنیا کی تاریکی کو ختم کر دیا تھا۔“ آخر اُن کے دل کی تڑپ کام آئی اور ان کی دعائیں مقبول ہوئیں اور زمانہ کی پستی اور انحطاط میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے بابا صاحب نے جنم لیا۔

بابا صاحب کی پیدائش کے بعد آپ کی والدہ محترمہ کے سینہ میں زخم پڑ گئے۔ اور وہ دودھ پلانے سے معذور ہو گئیں تو ایک غریب کمبی عورت مسماۃ اچما جو وہیں کے ایک قریبی گائوں کنمپکا میں رہتی تھی دودھ پلانے پر مقرر کی گئی۔ وہ روزانہ علی الصبح آکر

رات کو دیر تک رہتی اور تمام دن خدمت کے بعد اپنے گھر جاتی۔ بابا صاحب سے اس کو بے انتہا محبت تھی۔ کبھی کبھی وہ بابا صاحب کو اپنے گھر بھی لے جاتی اور ان کو ایک جھولے میں لٹکا کر خود گھاس کھودنے کے لئے گائوں سے باہر چلی جاتی۔

ایک دفعہ گرمیاں کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے گائوں میں آگ لگ گئی۔ آگ کے شعلے دیکھ کر اچمّا اپنے مکان کی طرف دوڑی۔ گرمیوں میں تاڑ پان کے مکانوں کے جلنے کا منظر جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کو اندازہ ہے کہ کیا قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ اِدھر تو آگ بھڑک رہی تھی اُدھر اچما کے دل میں اس سے بھی تیز قیامت برپا تھی۔ وہ چیخ رہی تھی کہ ہائے میرا بچہ جل گیا ہوگا۔ ہر چند کہ وہ جاہل عورت تھی۔ مگر اس کو ذمہ داری کا بے حد احساس تھا۔ چیختی تھی اور کپڑے پھاڑ پھاڑ کر دھاڑیں مارتی تھی کہ ہائے میرے بچے کو بچالو۔ مگر کس کی مجال تھی جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کے قریب جاتا۔ آگ بڑھتی گئی مگر جس جھونپڑے میں بابا صاحب اپنی طفلی کی نیند سو رہے تھے وہاں آگ پہنچنے تک کا رُخ یکدم بدل گیا اور آگ بجھ گئی۔ اچما دوڑ کر اندر گئی اور بابا صاحب کو اُٹھا کر کلیجہ سے لگا لیا۔ سارے گائوں میں اس بات کی خبر پھیل گئی اور گائوں والوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ یہ بچہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ یہ کوئی مہاتما ہے۔

ایسے واقعات اکثر بزرگوں کے متعلق سننے میں آئے ہیں، جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں مگر غور کیجئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی ہستیوں کو وجود میں لانے کے لئے جب فطرت صدیوں سے انتظامات کرتی ہے تو ایسے واقعات کیوں خلافِ قانون قدرت معلوم ہوں۔ جن کی آنکھیں عالمِ مثال کے پس پردہ دیکھتی ہیں انہیں ان واقعات کے پیچھے صانعِ قدرت کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اچما نے بابا صاحب کو تقریباً پانچ سال کی عمر تک اپنے سے جدا نہیں کیا۔ جب آپ کی عمر پانچ سال سے کچھ تجاوز کر گئی تو آپ کے والدین اپنے اعزاء سے ملانے کے لئے مالابار لے گئے۔ اور وہاں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد پھر وجیانگرم واپس آگے۔

ایک دن بابا صاحب کو نہایت عمدہ لباس جس میں کچھ کچھ نوابی شان تھی پہنا کر آپ کے والد محترم بازار میں لے جا رہے تھے۔ اس دن بابا صاحب میں ایک عجیب سادگی، عجیب حُسن اور عجیب کشش پائی جاتی تھی۔ اچما نے انہیں دُور سے دیکھا اور میرا بچہ میرا بچہ کہتی ہوئی دوڑی آئی اور بابا صاحب سے لپٹ گئی اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ معلوم نہیں اس پر بابا صاحب کو گلے لگانے میں کیا گذری۔ مگر اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہ آئی دو روز تک میرا بچہ میرا بچہ کہہ کر چیختی رہی اور دو دن کے بعد اپنے گائوں میں جان بحق

ہو گئی۔ بابا صاحب کے والد محترم نے جب یہ خبر سُنی تو اس کے گائوں گئے اور کفن و دفن کا انتظام کیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن بابا صاحب جن کی عمر اس وقت نو یا دس برس کی تھی بالکل خاموش اور عالمِ محویت میں رہے۔

## تعلیم:

عمر کا صحیح اندازہ نہیں مگر پہلے پہلے آپ کو راجہ بازار کے ایک تلگو اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں آپ نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کا داخلہ میونسپل اسکول میں کر دیا گیا۔ آپ کے ایک استاد جو اب بہت زیادہ ضعیف ہو گئے ہیں، بقیدِ حیات ہیں اور آج کل سارا وقت بابا صاحب کی خدمت میں گزارتے ہیں بیان کرتے ہیں کہ ''بابا صاحب کو پڑھائی سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ صرف رامائن اور بھگوت گیتا اور اسی قسم کی مذہبی کتابیں اور اگلے زمانہ کے بزرگوں کے قصوں کو نہایت غور سے سُنا کرتے تھے اور جب آپ کے والد بزرگوار پیغمبروں اور اولیا اللہ کے واقعات بیان کرتے تھے تو بڑے انہماک سے سُنتے۔''

ایک دن کا واقعہ ہے جب آپ شاید پانچویں جماعت میں تھے تو ایک ماسٹر نے اس غلطی پر کہ سبق یاد کر کے نہیں آئے تھے آپ کو خوب پیٹا یہاں تک کہ آپ کے بدن پر داغ پڑ گئے۔ آپ سہمے ہوئے اور تمتماتے ہوئے گھر پہنچے تو آپ کے والد صاحب کو بہت غصہ آیا۔ اور اس دن سے آپ کی تعلیم ختم کر دی گئی۔ ادھر ماسٹر صاحب جب گھر پہنچے تو انہیں تیز بخار چڑھا اور ان کے سارے بدن پر نیلے نیلے آبلے اُبھر آئے اور دوسرے ہی دن انتقال کر گئے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ استاد کی نیت نیک تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں بچوں کو مار کر تعلیم دینے کا عام رواج تھا۔ استاد چاہتا تھا کہ بچہ پڑھ لکھ کر کام کا ہو جائے۔ پھر بھی اسے سزا ملی۔

اس کو یوں سمجھئے جیسے کہ نماز کی نیت سے جا رہے ہوں اور راستہ میں تاریکی ہو اور کنواں بھی ہو۔ تو آپ کا کنوئیں میں گرنا لازمی ہے۔ اس قسم کے قصور کو کُدرت لاعلمی کی بناء پر معاف نہیں کرتی۔ بچہ اگر آگ کو کھانے کی چیز سمجھ کر پکڑ لیتا ہے تو اس کی معصومیت کام نہیں آتی بلکہ فطرت اس کا ہاتھ جلا دیتی ہے۔ اسی طرح جب منشائے فطرت اور قوم کی امید کے مجسمہ کو کوئی اذیت پہنچتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت خود اس کا انتقام لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب ایک مجسمہ اپنے روحانی شعور پر پہنچے اور صبر کا جامہ زیب تن کر لے تو اپنی مرضی سے فطرت کی آگ کو خود جذب کر لے یا مخلوق کے لئے باوجود ان کے دانستہ یا نادانستہ ظلم ڈھانے کے رحمت بن جائے۔

اسکول چھوڑنے کے بعد بابا صاحب بکریوں اور خرگوشوں سے جو گھر میں پلے ہوئے تھے کھیلا کرتے تھے۔ لیکن آپ زیادہ تر خاموش اور اکثر کسی خیال میں غرق رہا کرتے تھے۔ شام کے وقت جب محلہ کے لڑکے اور لڑکیاں انہیں کھیلنے کے لئے بلانے آتے تو ان کو بالکل غرق پاتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں ہلا ہلا کر جگانا پڑتا تھا۔ وہ کون سی فکر تھی، وہ کون سی سوچ تھی۔ وہ کون سا غم تھا، جس میں آپ غرق اور غلطاں رہتے تھے؟ کیا رازِ حیات کے افشا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے؟ یا یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔

بچوں کے کھیلوں میں تو آپ دلچسپی نہ لیتے تھے مگر ہندوئوں یا مسلمانوں کے مذہبی قصوں اور میلاد، کتھا جیسے مذہبی جلسوں میں آپ بہت شوق کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے اور وہاں ایسا محسوس کرتے تھے کہ سب کچھ اپنے ہی مشرب کی باتیں ہو رہی ہیں۔

آپ تنہائی میں ہر مذہب کے بزرگوں سے ایک قسم کی یگانگت، محبت اور کشش محسوس کرتے اور یہ سوچتے رہتے کہ آخر ان لوگوں میں ایسی کیا بات تھی اور وہ ایسے کون سے بھید پا گئے تھے کہ مرنے کے صدہا سال بعد بھی ان کے ذکر میں جو زندگی ہے، وہ زندہ انسانوں کے وجود میں نہیں ہے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ دنیا کیا ہے زندگی کے جھگڑے کیوں ہیں، خوشی اتنی کیوں کمیاب ہے، غم اس قدر کیوں محیط ہے، اور سکون و قرار کیوں ناپید ہے، دل اس قدر کیوں بے قرار ہے، کس چیز کے لئے بے چین ہے۔ کیا ڈھونڈ رہا ہے، اور اس کو کیا کرنا ہے۔

آپ کے والد محترم کو آپ سے انتہائی محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ آپ کی والدہ محترمہ، اللہ انہیں بخشے آپ پر بہت سختی کرتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ آپ نہایت ہی ضدی اور ہٹی تھے جو بات دماغ میں سما جاتی تھی چاہے وہ اُلٹی ہو یا سیدھی پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ کھانے کے وقت جب سارے گھر کے لوگ دستر خوان پر جمع ہوتے اور آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو کھانے پر لات مار کر فوراً ہی کھڑے ہو جاتے۔ ان کی کسی ایسی حرکت پر ان کی والدہ انہیں کھینچ کر باہر لے جاتی تھیں اور اس قدر پیٹتی تھیں کہ جسم پر مار کے نشان اُبھر آتے تھے، یا کبھی کبھی چمٹا گرم کر کے داغ بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر یہ تمام سزائیں بے اثر ثابت ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ جب ان اذیتوں کی تکلیف دب جاتی تھی تو بابا صاحب سب کچھ بھول جاتے تھے۔ اور پھر سے اپنی روش پر آجاتے تھے۔

آپ کے والد محترم جب ان سختیوں کو دیکھتے تو بہت متاثر ہوتے۔ اپنی اہلیہ سے تو کچھ نہ کہتے مگر بابا صاحب کو گلے سے لگا لیتے، پیار کرتے اور ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ آپ کے والد صاحب میں باپ کی شفقت ہی نہیں بلکہ ماں کی مامتا بھی موجود تھی اور وہ جب بابا صاحب کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بہت دور کی کوئی خاص چیز دیکھ رہے ہیں۔

ان کو نامعلوم طور پر اس کا احساس تھا کہ یہ الھڑ بچہ مافوق الفطرت ہے۔ اس کی ظاہری حرکات قابلِ غور نہیں۔ آپ اکثر بابا صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نماز پڑھتے اور عمدہ قرأت کے ساتھ تلاوت قرآن فرماتے۔ اس وقت بابا صاحب نہایت ادب و احترام سے دوزانو بیٹھ کر سُنا کرتے۔ بابا صاحب کو اپنے والد سے بے حد محبت تھی۔ اگرچہ آپ کو ظاہری طور پر ان کی اطاعت مد نظر تھی۔ مگر دل اظہارِ محبت سے شرماتا تھا۔

شام کے وقت بابا صاحب اکثر اپنے ساتھیوں کو لے کر کالے تالاب کی طرف ٹہلنے کے لئے نکل جاتے۔ حالانکہ بچپن کی ہر بات آپ میں موجود تھی اور نوعمروں کے ہر کھیل اور شرارت میں انہماک کا اظہار کرتے مگر پھر بھی آپ ساتھیوں سے زیادہ بات چیت نہ کرتے تھے۔ بابا صاحب کے بچپن کے کوئی دوست ابھی تک موجود ہیں۔ خاص کر رحمن خان صاحب جن کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ (انہوں نے قادر نگر۔ وزیانگرم میں قیام کر لیا ہے) ان لوگوں کا کہنا ہے کہ بابا صاحب بچپن ہی سے یہ نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا چیز ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جھوٹ بولنے کی صلاحیت ہی آپ میں نہ تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ میں سیدھا پن تو اتنا تھا کہ کوئی بھی کچھ پوچھتا تو سادگی کے ساتھ جو بھی بات صحیح ہوتی بتا دیتے۔ بچپن کے دوستوں میں سے کوئی اگر زور سے قہقہہ لگاتا تو بابا صاحب ایک طرف ہٹ کر ایک قسم کی فکر میں غرق ہو جاتے۔ اکثر دیکھا گیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اور جیسے ہی کوئی ساتھی کسی کھیل میں مشغول ہوا تو الگ ہو گئے اور گھنٹوں ساکت کھڑے رہے۔

آپ کو کھیل کود سے زیادہ شوق نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی کبڈی یا گلی ڈنڈا ضرور کھیل لیا کرتے تھے۔ آپ کا مرغوب مشغلہ یہ تھا کہ دو ایک ساتھیوں کو لے کر بہت دور ٹہلنے نکل جاتے۔ یا پھر گھوڑے کی سواری کیا کرتے۔ ایسا ہوتا تھا کہ جب راجہ کے سائیں گھوڑوں کو ٹہلانے کے لئے لے جایا کرتے تو کبھی کبھی آپ کے گھر کے پاس بھی گھوڑا لے کر آتے اور آپ کو سواری کراتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک انسپکٹر کے گھوڑے پر سوار ہو کر کالے تالاب کی طرف نکل گئے۔ گھوڑا تھا تو سیدھا مگر اس دن بڑی تیزی سے گیلپ کرتا ہوا تالاب کی سڑک سے بہت دور نکل گیا اور ایک بڑے برگد کے درخت کے پاس چٹانوں میں کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک اُٹھا۔ بابا صاحب اس پر سے گر کر بیہوش ہو گئے۔ جب گھوڑا بغیر سوار کے گھر پہنچا تو لوگوں کو تشویش ہوئی اور وہ کمبل روڈ پر گئے اور بابا صاحب کو چٹانوں کے قریب زخمی پایا گیا۔ راہ گیر آپ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ مقام اس زمانہ میں ایسا وحشت ناک سمجھا جاتا تھا کہ نہ صرف جنگلی درندوں اور سانپ بچھوؤں کے ڈر کے مارے بلکہ جنوں اور ارواحِ خبیثہ کے خوف سے بھی دن کے وقت کوئی تنہا نہ گذرتا تھا۔

یہ وہی مقام ہے جہاں کے لئے کئی سال بعد بابا تاج الدین اولیاؒ کا اشارہ بابا صاحب کے لئے ہوا تھا کہ تمہیں اس جگہ قیام کرنا ہے اور یہیں حق کا جھنڈا گاڑنا ہے۔

جوں جوں بابا صاحب کی عمر بڑھتی گئی آپ تنہائی کو زیادہ پسند کرنے لگے اور اکیلے کمبل روڈ پر جانے لگے۔ وہاں جا کر یہ حالت ہونے لگی کہ گھر آتے تو نہ کھانے کا خیال ہوتا اور نہ ہی سونے کا۔ کبھی کبھی جب بہت تھک کر واپس آتے تو جوتا اتارے بغیر ہی لیٹ جاتے اور آپ کے والد صاحب نہایت شفقت سے آپ کے کپڑے اتارتے اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتے۔ کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ تنہائی پسندی، یہ استغراق اور یہ انوکھے انداز بے معنی نہیں ہیں۔

بچپن میں بابا صاحب کی طبیعت میں بے انتہا ڈر تھا۔ آپ تاریکی سے بہت ڈرتے تھے اور اندھیرا ہونے کے بعد پیشاب تک کے لئے اپنے والد صاحب کو ساتھ لے جاتے اور جب تک پیشاب کرتے رہتے ان کا ہاتھ پکڑے رہتے۔ کسی نئی جگہ یا اجنبی لوگوں میں بھی جانے سے آپ بہت گھبراتے تھے۔ رات کے وقت اگر کوئی گیدڑ (کولا) بھی بولتا تھا تو ڈر سے پیشاب خطا ہو جاتا تھا۔ آپ کی والدہ آپ کو اکثر یہ کہہ کر ڈرایا کرتی تھیں کہ بیراگی گھومتے پھرتے ہیں وہ بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ان کو کڑاہی میں اُبال کر ان سے مومیائی بناتے ہیں۔ اس لئے آپ جہاں کسی بیراگی کو دور سے بھی دیکھ لیتے تو راستہ کترا کر گھر کی طرف بے تحاشا بھاگے چلے جاتے۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ ابھی عمر دس بارہ سال کی ہوگی۔ چہار شنبہ کے شب صبح کے چار بجے کا وقت تھا کہ آپ نے بشارت میں دیکھا کہ آپ کے مکان کے بالکل مقابل جو ایک بزرگ سیلان شاہ صاحب کا مزار ہے اور جس پر آپ اکثر جوتوں سمیت کودتے پھاندتے تھے، اس مزار سے بزرگ نکلے ہیں اور سبز لباس پہنے آپ کے دروازہ سے باہر کھڑے ہوئے ہیں اور جیسے ہی بابا صاحب دروازہ سے باہر نکلے تو ان بزرگ کو بابا صاحب نے کوئی فقیر سمجھا اور ڈر کے گھر کے اندر لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ سیلان شاہ صاحب نے آواز دے کر کہا کہ ڈرو مت، اِدھر آئو۔ جب آپ قریب گئے تو ہاتھ پکڑ کر شاہ صاحب اسی مزار کی طرف لے گئے اور جیسے ہی یہ دونوں قریب پہنچے، تو مزار شق ہوا اور نیچے کی طرف اترتی ہوئی سیڑھیاں نظر آئیں۔ دونوں سیڑھیوں سے اندر اُترے۔ یہاں تک ایک بان کی چارپائی تھی جس پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ سیلان شاہ صاحب نے حضور کو چارپائی پر بٹھلایا اور خود پائینتی بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ آپ ہماری قبر پر جوتوں سمیت کودتے پھاندتے پھرتے ہیں۔ آپ بڑے ہیں۔ سارے دفتر آپ کے ہاتھ میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضور نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاہ صاحب نے کوئی چیز پلنگ کے نیچے سے اُٹھا کر آپ نے اسے کھایا نہیں مگر مٹھی میں بند کر کے رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر آگئے۔ اور قبر جو شق تھی بند ہوگئی۔ شاہ صاحب آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے

دروازہ تک پہنچا کر واپس چلے گئے۔ آپ نے سارا حال اپنے والد صاحب کو جنہیں آپ بادشاہ کہا کرتے تھے سُنا دیا۔ اتنے میں آنکھ یکدم کھل گئی اور پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی۔ چونکہ اکیلے بہت ڈرتے تھے، والد صاحب کو اُٹھا کر باہر تشریف لے گئے اور واپسی پر یہ کہا کہ خواب میں تو سنا چکا ہوں مگر ظاہر میں بھی سُن لیجئے۔ اور ساری بشارت سنائی۔ آپ کے والد صاحب بہت خوش ہوئے اور اسی روز جمعرات کے دن اس مزار پر پھول چڑھائے اور شیرینی پر فاتحہ دی اور رات کو خوب چراغاں کیا۔

ایسی کئی اور بشارتیں بچپن میں آپ کو ہوتی رہیں اور آپ برابر والد صاحب کو سناتے رہے۔ آپ کے والد ان چیزوں کو خوب سمجھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ آپ سے محبت اور پیار کرتے تھے بلکہ اپنا بیٹا ہوتے ہوئے بھی احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حال یہ تھا کہ آپ کو چارپائی پر سُلاتے تھے اور خود بازو میں فرش پر سو جاتے۔

اکثر شام کے وقت محلہ کی بڑی بوڑھیاں جمع ہو جاتی تھیں اور آپ کو بٹھا کر خدا جانے کیا اوٹ پٹانگ کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ان بوڑھیوں کے لئے بابا صاحب اپنی جیب خرچ سے افیون اور پُٹھے خرید کر لاتے تھے اور ان کو دیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بڑی بی ابھی تک زندہ ہیں جن کا ماہانہ مقرر ہے اور وہ بابا صاحب کے دربار سے ہر ماہ لے لیا کرتی تھیں۔

سنہ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے کہ بابا صاحب اپنے حجرۂ مبارک میں قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خادم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ بابا صاحب کی آنکھیں پُرنم تھیں اور سر اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ اور نظر ایسی تھی کہ جیسے کوئی دور کی چیز دیکھ رہے ہوں۔ اس کیفیت میں بابا صاحب نے بچپن کو یاد کر کے فرمایا۔ ”آہ بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ کیسی آزادی تھی۔ نہ کسی چیز کا ہوش تھا، نہ کسی چیز کا خیال۔ طبیعت میں شرارت اور ضد اس قدر تھی کہ جس کام کو بھی منع کیا جاتا تھا اسے اور زیادہ انہماک اور جوش سے کرتا تھا۔ اگر کہا جاتا تھا ک درختوں پر مت چڑھا تو گرتا بھی تھا اور چوٹ بھی کھاتا تھا مگر خوب درختوں پر چڑھ کر کودنا پھاندتا۔ ساتھیوں کے ساتھ کھیل، سیر اور تفریح۔ اللہ اللہ کیا خواب تھا۔ بزرگوں کی کہانیوں میں استغراق کسی نہ معلوم شے کی نامعلوم تلاش۔ ہنسی خوشی جانوروں کے ساتھ کھیلنا۔ بڑے بڑے درختوں میں جھولے ڈال کر جھولنا۔ بڑی بوڑھیوں کی بے معنی کہانیاں۔ والد صاحب قبلہ کا پیار اور ان کی محبت۔ لیکن اب میں کہاں ہوں۔ کیوں ہوں۔ کیا کر رہا ہوں۔ اور کہاں جانا ہے۔ کیا یہ بچپن پھر بھی آسکتا ہے؟

ہمیں کچھ اور ہی قادر کے پردے میں نظر آیا — جمالِ من رآنی اور جلووں میں نکھر آیا

یہی وحدت کا عرفاں ہے یہی رحمت کا ساماں ہے — کہ سوزِ لا الٰہ میں سازِ الا اللہ اُبھر آیا

جنوں کی وادیوں کو کاٹ کر معراج تک پہنچا — کہاں جا کر ہمارے پاس عشقِ باخبر آیا

ہزاروں سال موجِ نور جب ساحل سے ٹکرائی
بڑی مشکل سے اس کی تہ میں اِک چیدہ گہر آیا

جلائی سورۂ اخلاص نے قندیل قادرؔ کی
تو پھر اس قاف کے اندر خدا خود جلوہ گر آیا

فنافی الذات ہونا بحر میں قطرے کا گم ہونا
خوشا جوشِ طلب دریائے حق قطرے میں در آیا

کلیم اللہ کو بھی جستجو ہے جس تجلی کی
یہیں پر وادی سینا اور اُڑ کر وہ شرر آیا

یہ درگاہِ محبت ہے یہ دل والوں کی بستی ہے
ردائے نور میں یاں صاحبِ شق القمر آیا

مجسم عشق بن جانا سراپا حُسن ہو جانا
انہی سے یہ ہنر آیا انہی کو یہ ہنر آیا

طریقت میں شریعت میں کچھ ایسے راز ہیں پنہاں
کہ جن کو کھولنے کے واسطے یہ دیدہ ور آیا

حکیم علم سبحانی، امین رازِ یزدانی
دل عُشاق پر یہ بن کے قراں سر بسر آیا

(رحمان بابا)

☆...☆...☆